افسوس تھا۔ درحقیقت مرزا پر یہ بہت ہی سخت وقت تھا۔ خاص مرزا کے دل پر جو کچھ گذر گیا اس کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بیوی بچوں میں قیامت برپا تھی۔ مقدمے کی آخری پیشی میں کوئی چار دن اور باقی تھے۔ ہیڈ کلرک اور ان کے ماتحت بعض اہلِ دفتر جو رشوت خوری میں ان کے کاسۂ لیس تھے بہت ہی خوش تھے۔ صاحب کو مرزا کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ایک تو یہ اس سبب سے کہ ہیڈ کلرک نے ان کو مرزا کی طرف سے پہلے ہی بدظن کر رکھا تھا۔ دوسرے ایک سبب یہ بھی تھا کہ صاحب بہادر کسی قدر بدزبان تھے اور مرزا کو اس کی برداشت نہ تھی۔ ایک دن دورے پر مرزا سے اور ان سے ایک واقعہ پر تکرار ہو چکی تھی۔ واقعہ یہ تھا۔

صاحب بہادر لیول کر رہے تھے۔ مرزا پیسنگ (قدموں سے پیمائش کرنا) کر کے کھونٹیوں پر گز رکھواتے جاتے تھے۔ خلاصی جو گز لیے ہوئے تھا پیمائش کے کام سے واقف نہ تھا۔ اس نے ایک گز کو بجائے کھونٹی کے زمین پر پڑھوا دیا۔ صاحب اس گز کو پڑھ کے آگے بڑھے۔ مرزا کو جب اس غلطی کی اطلاع ہوئی تو بہ خیال اس کے کہ پیمائش غلط نہ ہو جائے صاحب سے کہہ دیا۔ اب صاحب کو دوبارہ لیول کر کے گز پڑھنا پڑا۔ اس بات پر صاحب بہت جھنجھلائے اور بجائے اس کے کہ مرزا سے خوش ہوتے سخت کلمہ کہہ بیٹھے۔ مرزا کو بہت ہی ناگوار ہوا مگر چونکہ اس باب میں تھوڑی سی غفلت مرزا کی بھی تھی اسلیے خاموش ہو رہے۔ اس پیمائش میں تھوڑی دور اور آگے جا کے صاحب نے حکم دیا کہ گاؤں کے سرحدے پر گز رکھواؤ۔ مرزا اس علاقہ میں چند ہی روز سے آئے ہوئے تھے اور کبھی اس طرف دورے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لیے لوگوں سے سرحدہ دریافت کرنے لگے۔ اس میں دیر لگی۔ اب شام کا وقت تھا صاحب

کو ڈیرے پر پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ چاہتے تھے پیمائش جلد ختم کریں۔ اس لیے بہت ہی جھنجلائے ہوئے تھے۔ چھوٹتے ہی مرزا کو اُلو کہہ بیٹھے۔ اس وقت مرزا نے بھی یہ گستاخی ہوئی کہ انھوں نے صاف جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ صاحب اس کے عادی نہ تھے اس لیے سخت ناگوار ہوا۔ قریب تھا کہ نوبت بہ مشت مُشت پہنچتی۔ مگر چپراسیوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ سہ عمدہ مل گیا تھا۔ پیمائش ختم ہوئی۔ گاڑی صاحب کی پہنچ گئی تھی۔ سوار ہوئے۔ اب بالکل رات ہو گئی تھی۔ ڈیرہ اس مقام سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ مرزا کو معلوم نہ تھا کہ صاحب کہاں تک پیمائش کرتے چلے جائیں گے۔ گھوڑے کا حکم نہ دیا تھا۔ صاحب بہادر خود گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ مرزا پا پیادہ ہمراہ ہوئے صاحب کا غصہ اب فرو ہو گیا تھا۔ باتیں ہونے لگیں۔ بڑی دور تک مرزا پا پیادہ گاڑی کے ساتھ چلے گئے۔ صاحب کا اردلی اور چپراسی دونوں گاڑی پر تھے آخر صاحب گاڑی تیز کر کے آگے بڑھ گئے۔ مرزا بیچارے کوئی نو بجے رات کو سردی کھاتے ہوئے اپنے ڈیرے پر پہنچے۔ غرضکہ صاحب بہادر سے اور مرزا سے ناچاقی ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ امر کچھ ایسا نہ تھا لیکن اس جرم پر صاحب نے بھتہ بند کر دیا تھا۔ مرزا نے اس کی کوئی شکایت افسرِ اعلیٰ سے نہ کی۔ اِس واقعہ کی خبر چھپی رہنے والی نہ تھی۔ ہیڈ کلرک صاحب کو حاشیہ لگانے کا خوب موقع ملا۔ مرزا نے بہت چاہا کہ اپنی کارگزاریوں سے صاحب کو خوش کریں۔ مگر صاحب کے دل میں ان کی طرف سے گنجایش ہی نہ تھی۔ جو کام یہ قابلِ تحسین کرتے تھے صاحب اس کو ان کا فرضِ منصبی تصور کرتے تھے اور اگر بمقتضائے بشریت کسی قسم کی فروگذاشت ہو جاتی تھی تو صاحب کو اس کی یادداشت کی فکر ہوتی تھی۔ مقدمۂ فوجداری میں صاحب نے اگرچہ قانونی کارروائی کی اور صاحب

سے کوئی امر خلاف صدق نہیں ہوا۔ اس میں صاحب کا کیا گناہ تھا کہ ان کی نوٹ بک غلط کر دی گئی۔ جو لوگ ان معاملات سے واقف تھے ان کی یہ رائے تھی کہ صاحب کو مرزا کے ساتھ کچھ رعایت کرنا تھی۔ اگرچہ صاحب کو شل ہیڈ کلرک کے اس کی خوشی نہ تھی کہ مرزا قید ہو جائیں۔ مگر مرزا کے قید ہو جانے پر صاحب کو کچھ افسوس بھی نہ تھا۔ افسر اور ماتحت میں ضرور ہے کہ کسی قدر ہمدردی ہو۔ محض قانونی تعلق سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ ہمدردی دو طرح سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک تو جائز طریقے سے۔ وہ یہ کہ ماتحت کارگذار ہو اور افسر قدر شناس۔ اور دوسرے بطور ناجائز۔ وہ یہ کہ ماتحت خوشامدی ہو اور افسر خوشامد پسند۔ نہ صاحب خوشامد پسند تھے نہ مرزا خوشامدی۔ مرزا کارگذار ماتحت تھے اور صاحب قدر شناس مشہور تھے۔ مگر ہیڈ کلرک صاحب نے واقعات پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ مرزا کو اپنی کارگذاری دکھانے اور صاحب کو قدر شناسی کرنے کا موقع نہ دیا۔ مرزا کو اس کی بھی پروا نہ تھی۔ اس لیے کہ یہ اکھڑ آدمی تھے۔ یہ صرف اپنا کارِ منصبی کر کے خوش ہوتے تھے کارِ منصبی کا عوض اپنی تنخواہ کو سمجھتے تھے۔ اس کے لیے کسی قسم کے صلے یا ستائش کو ضعفِ طبیعت خیال کرتے تھے۔ ان کی ششماہی کارگذاری کی رپورٹوں میں ان کے گذشتہ افسروں نے سطریں کی سطریں تعریف میں لکھی تھیں سوائے اس ششماہی کے جس میں برا بھلا کچھ نہ لکھا گیا تھا اور اس کے بعد بھتہ بند کر دیا گیا تھا۔

معاملات کی یہ صورت تھی۔ جب مقدمہ قائم ہوا۔ اب صرف چار دن اور باقی ہیں۔ ہر شخص جس کو ان سے تعلق خاطر تھا، اسی افسوس میں تھا کہ مرزا مفت پھنسے مرزا بے چارے خاموش ہیں کہ شکوہ نہ شکایت تقدیر پر شاکر ہیں ؎

ناکامیٔ امید بھی ہے رحم کے قابل مایوس ہیں ایسے کہ دعا بھی نہیں کرتے

مرزا کا بیان ہے کہ میں نے اس باب میں خدا سے کسی قسم کی دعا نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میرا عقیدہ ہے کہ خدا مجھ پر میرے ماں باپ سے زیادہ مہربان ہے۔ وہ دانائے راز اور کارساز ہے۔ اس حالت میں جو میرے حق میں مناسب ہوگا وہی کیا جائے گا۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اس خیال سے دعا کچھ ضروری نہیں۔ رہی یہ بات کہ دعا سے شانِ عبودیت ظاہر ہوتی ہے۔ اِس کے واسطے دعائے قنوت اور دیگر ادعیہ جو نماز میں داخل ہیں کافی ہیں۔ ہماری رائے اس امر میں مرزا کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ سوائے اظہار عبودیت کے ایک قسم کا خلوص بھی دعا سے پایا جاتا ہے۔ خیر اس موقع پر اس مسئلہ پر زیادہ بحث کرنا ہم کو منظور نہیں۔ مرزا کی سیرت کا بیان من وعن مطلوب ہے۔

مرزا کی قسمت کے فیصلے میں تین دن باقی ہیں۔ شیو بہاری ٹھیکیدار اصل مستغیث اور رام دین ایک اور ٹھیکیدار دونوں شراب خانے میں بیٹھے ٹھرا اڑا رہے ہیں اور یہ باتیں ہو رہی ہیں۔

رام دین :۔ کہو اس مقدمہ میں کیا ہوا؟

شیو بہاری :۔ کون مقدمہ؟ مرزا والا؟

رام دین :۔ وہی مقدمہ۔

شیو بہاری :۔ مرزا اب نہیں بچتے۔ گئے چھ سات برس کو۔

رام دین :۔ بڑے پُن کا کام کیا تم نے۔

شیو بہاری :۔ کیوں پُن کا کام کیوں نہیں کیا۔ ایسے کا جانا ہی اچھا ہے۔ آپ کھائے نہ دوسروں کو کھانے دے۔ باپ قسم، بھیا رام دین۔ جب سے یہ مرزا اس علاقے میں آیا، میرا تو دس بارہ ہزار کا نقصان ہو گیا۔

رام دین :۔ کیوں، کیا تمہارا کوئی بل کاٹ دیا ؟
شیو بہاری :۔ بل تو نہیں کاٹ دیا مگر بالو کی صفائی میں ہم کو ہزار ڈیڑھ ہزار سال میں مل جایا کرتے تھے۔ چار برس سے ایک کوڑی بھی نہیں ملی۔
رام دین :۔ کیوں، کیا ٹھیکہ توڑ دیا ؟
شیو بہاری :۔ نہیں ٹھیکہ تو نہیں توڑا۔ پیمایش میں کوئی گنجایش نہیں رکھی۔ دو سو پچیس سات آنہ وصول ہے۔ کہو جب اس کام میں دو سو پچھتر سال میں ملے تو ہم کیا کھائیں گے ؟
رام دین :۔ تو پیمایش میں کم ناپا ہوگا ؟
شیو بہاری :۔ تم تو سمجھتے ہو پھر نادان بنتے ہو۔ کون کہتا ہے کہ کم ناپا۔
رام دین :۔ پھر ان کی کیا خطا۔ جتنا کام تم نے کیا تھا۔ اس کے دام دلوا دیے۔ ایک ہم کہیں گے کہ مرزا صاحب پیمایش کے بڑے سچے ہیں۔ ہم نے تو ایک بل بنوایا تھا۔ اس میں دیکھ لیا۔ ہمارا جتنا کام تھا اس سے ایک انچ نہ گھٹایا نہ بڑھایا۔ نہ ہمارا نقصان کیا نہ سرکار کا۔ پورے دام دلوا دیے۔ ہیڈ کلارک صاحب پانچ روپیہ مانگتے تھے۔ میں نے اپنا پورا بل آنہ پائی سے وصول کر لیا کوڑی نہیں دی۔ دیتا کیوں ؟ کام میں نے کیا۔ محنت کی روپیہ لگایا۔ پھر ہیڈ کلارک کون ہوتے ہیں جو روپیہ لیتے۔
شیو بہاری :۔ کتنے کا بل تھا ؟
رام دین :۔ پانچ ہزار چھ سو اکانوے روپیہ تیرہ آنہ سات پائی کا۔
شیو بہاری :۔ اور اوورسیر صاحب کو کیا دیا ؟
رام دین :۔ مرزا کو ؟
شیو بہاری :۔ ہاں۔ اور کسے ؟

رام دین :۔ اتنی تو میں قسم کھا سکتا ہوں کہ مرزا نے کبھی ایک پیسہ گھوس کا نہیں کھایا۔ تم نے اس غریب کو بے کار پھنسایا ہے۔ دیکھنا کیا بھگتان بھگتتے ہو۔ اور پھر جھوٹی گنگا عدالت میں اٹھائی۔ مرزا دیوتا آدمی ہے۔ اس کو ستا کے پھل نہ پاؤ گے۔ اتنا کہہ کے رام دین نشہ کی دھن میں زار وقطار رونے لگا۔

شیو بہاری :۔ مرزا تو اب جاتے ہیں۔ تم رویا کرو۔ جو ہمارا نقصان کرے اس کے باپ کو ہم پھنسائیں گے۔

رام دین :۔ ابے جا۔ تو نے دھرم ناس کیا۔ ایسے گؤ آدمی کو پھنسایا۔ پرمیشر چاہے گا تو اس کا عوض اسی جنم میں مل جائے گا اور دوسرے جنم میں جو بھگتان بھگتنا پڑے گا اسے کون جانے۔

شیو بہاری :۔ اور جو دوسرے کا پیٹ کاٹے اس کا کیا حال ہوگا ؟

رام دین :۔ کون سا تیرا پیٹ کاٹا۔ جتنا تو نے کام کیا تھا اس کا روپیہ دلوا دیا۔

شیو بہاری :۔ اور آپ جو رشوت کھائی ؟

رام دین :۔ تو جھوٹا ہے۔ مرزا نے ایک دمڑی رشوت نہیں کھائی۔ ۷ مئی کو جس دن تو نے بیان کیا ہے کہ رشوت دی ہے اس دن مرزا صاحب کے ساتھ دورے پر تھے۔ تو بیان کرتا ہے کہ برہام پور کے پڑاؤ پر پانسو روپیہ سات بجے رات کو لے گئے۔

شیو بہاری :۔ تو کیا اس میں جھوٹ ہے ؟

رام دین :۔ سب جھوٹ ہے۔ اس دن چار بجے صاحب نے سیتا نالے کا پل دیکھا مرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ وہیں میں بھی تھا۔ میری مدت گئی تھی۔ میرے چٹھے میں صاحب کا ملاحظہ لکھا ہوا ہے۔ وہاں سے چار میل کے آگے

صاحب نے شیودین کھیڑہ میں قیام کیا۔ دوسرے دن صبح سے شام تک صاحب کے ساتھ پیمایش میں رہے۔ شیودن کھیڑے سے برہام پور ۲۴ میل کے فاصلے پر تجھ سے رشوت لینے کس وقت گئے تھے۔؟

شیوبہاری :۔ ۷ مئی کو صاحب دورے پر گئے ہی نہیں۔ ان کی نوٹ بک میں ۱۷ تاریخ کا دورہ لکھا ہے تو ۷ مئی کا دورہ بک رہا ہے۔

رام دین :۔ سات کے سترہ دفتر میں بنے ہیں۔ ہمارا چھٹا تو کوئی دیکھے۔

شیوبہاری :۔ ابے تیرا چھٹا کون پوچھتا ہے۔ صاحب کی نوٹ بک صحیح ہے کہ تیرا چھٹا صحیح ہے ؟

رام دین :۔ صاحب کی نوٹ بک میں تو جعل بنا ہے۔ ہمارے چھٹے میں کون جعل بناتا ؟

شیوبہاری :۔ پھر تو نے گواہی دی ہوتی ؟

رام دین :۔ ہم گئے ہوئے تھے کانپور۔ نہیں تو گواہی ضرور دیتے۔ اور اب جو موقع ہوگا تو کیا گواہی نہ دیں گے ؟

اس تقریر کو سن کر شیوبہاری ذرا دھیرے ہوئے۔ نشہ ہرن ہونے لگا۔ کیونکہ ابھی مقدمہ کی تاریخ کے تین دن باقی تھے۔ مدعا علیہ کو مزید عذر کی گنجایش باقی تھی۔

اِدھر تو دونوں ٹھیکیداروں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر لکھئی چمار جو مرزا کے سائیس کا بھائی تھا۔ ٹکے کا ٹھرا اڑانے بھٹی خانے میں آیا کرتا تھا اس نے جو اس مقدمہ کی باتیں سنیں۔ ٹھرا پی کے نیم کے درخت کی آڑ میں چلم پینے لگا۔ مقدمہ کی روداد سے اسکو بھی ایک گونہ تعلق تھا۔ اس دن خوامخواہ ٹکے کا ٹھرا پیا اور چپکا بیٹھا سنا کیا۔

گھر پر پہنچتے ہی اپنے بھائی متّا سے کل واقعہ بیان کیا۔ متّا نے دوسرے دن صبح کو مرزا صاحب سے یہ سب حال کہا۔ چلیے رام دین مع چٹھے کے طلب ہوگئے۔ یہی شہادت مرزا کی بریت کے لیے کافی تھی لیکن ایک امر خداساز واقع ہوا۔ شیو بہاری اور رام دین کی تقریر اگرچہ چنداں دلچسپ نہ تھی۔ مگر مرزا صاحب کے ایک دوست نے اس کو لکھئی سے دوبارہ سنا اور اسے قلم بند کر کے رام دین کے آگے دہرادی اور انگریزی میں ترجمہ کر کے اخبار میں بھیجدی۔ یہ اخبار صاحب سپرنٹنڈنٹ انجینیر کی نظر سے بھی گذرتا تھا۔ انھوں نے جو اس کو پڑھا اسی وقت اپنی فائل سے ایک ڈیمی آفیشل چھٹی صاحب ایگزیکٹیو انجینیر کی نکال کے دیکھی۔ اس میں سیتا نالے کے ملاحظہ کا کچھ ذکر تھا۔ اس میں فی الواقع ۷ رمئی از مقام شیودین کھیڑہ تحریر تھا۔ صاحب موصوف نے اسی وقت ایک چھٹی ایگزیکٹیو انجینیر کو اور ایک صاحب سشن جج کو تحریر کی۔ اب مقدمہ کی صورت بدل گئی۔ مرزا نہایت عزت کے ساتھ بری ہوئے۔ شیو بہاری پر الٹا مقدمہ چلا۔ بچا سات برس کو گئے۔ ہیڈ کلرک پھنس ہی گئے ہوتے مگر جعل بنانا ثابت نہ ہو سکا۔ اس علاقہ سے تبدیل کر دیے گئے مرزا وہیں رہے۔ چند ہی روز بعد صاحب کی بھی تبدیلی ہوئی۔ دوسرے صاحب جو آئے ان سے مرزا سے خوب موافقت رہی اور سپروائزر کے عہدے تک ترقی ہوئی۔

احباب

ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان کے ذہن کی ترقی کے دو سبب ہیں ایک

داخلی اور دوسرا خارجی اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ داخلی میں خود انسان کی ذاتی استعداد اور موروثی قابلیت شامل ہے۔ اور خارجی میں ان اسباب طبیعی کا ذکر شامل ہے جو وقت پیدائش سے نشوونما تک انسان کو گھیرے ہوئے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اور نظام معاشرت کی تاثیر شامل ہے۔ یہ چار امر انسان کی سیرت کے جزو اعظم ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ مرزا عابد حسین کی سیرت پر ان کا کس حد تک اثر پڑا۔ ذاتی استعداد سے قطع نظر کر کے جب ہم اور اجزا کی طرف غور کرتے ہیں تو ہمیں اور لکھنؤ کے رہنے والوں میں اور ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مرزا باقر حسین ان کے والد مرحوم نے ان کی تعلیم میں حتی الوسع غفلت نہیں کی۔ موروثی قابلیت کا یہ حال ہے کہ ان کے خاندان میں سوائے ان کے اور کوئی ایسا پڑھا لکھا نہ تھا جس کو پڑھا لکھا کہہ سکیں۔ والد ماجد ان کے فارسی میں کامل تھے۔ دادا جان صرف معمولی پڑھے لکھے تھے جیسے اس زمانے کے شرفاء پڑھے ہوتے تھے اور ان سے جو پہلے لوگ ان کے اجداد میں تھے وہ سب کے سب ان پڑھ۔ ناخواندہ (امید ہے کہ مرزا صاحب ہم کو معاف کریں گے) اکھڑ سپاہی تھے۔ ان لوگوں میں پڑھنا لکھنا عیب سمجھا جاتا تھا اور اس سے پیشتر کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ دشتِ قپچاق کے قزاقوں کی حالت سے کون واقف نہیں ہے۔ نظامِ معاشرت کی طرف نظر کرنے سے بالکل میدان خالی دکھائی دیتا ہے۔ مرزا عابد حسین کے ہم محلہ ہم عمر لڑکوں میں سے کوئی بھی اس لائق نہ تھا جس کا ذکر ان کے افسانے کے ساتھ کیا جائے۔ گھر کے پاس کچھ کہاروں کے گھر تھے۔ ان کے لڑکوں میں درگا پڑھ کے سرفراز محل کی ڈیوڑھی پر کہاروں کا مہرا بن گیا۔ دیبی بنیا محلے میں

رہتا تھا۔ اس کا لڑکا مہکو لال سعادت گنج میں آڑھتیا ہو گیا۔ مسلمان شریفوں میں سے ایک صاحب فدا علی نامی جو بچپن میں چند روز تک ان کے ساتھ لال چرکودن کے شوق میں شریک رہے۔ فدا علی نے پڑھ کے کبوتر پالے۔ یہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے انٹرنس پاس کیا۔ انھوں نے سو کی ٹکری اسی دن اڑا کے نواز گنج تک بھیجی اور قربان علی نے جو اس فن میں استاد تھے ان کے پندرہ کبوتر مار لیے۔ یہ انجینیر ہوئے۔ وہ نواب شہنشاہ مرزا کی سرکار میں کبوتر باز مقرر ہو گئے۔ جب یہ پنشن لے کے گھر آئے ہیں تو میاں فدا علی نے اس زمانے میں نوکری چھوڑ دی تھی۔ آخر میں انھوں نے یہ روزگار کیا تھا کہ کبوتر، بٹیر، بط، قازیں مول لے کے مٹیا برج روانہ کرتے تھے۔ محلہ میں ایک نواب صاحب رہتے تھے۔ بہو بیگم صاحبہ کے خاندان میں ان کے صاحبزادے سلطان مرزا چنڈو بنانے میں مشاق ہوئے۔ بالشت بھر چھینٹا لٹکتا ہوا انھیں کے قوام میں دیکھا۔ چھٹن نامے ایک لڑکا ان کے عزیزوں میں تھا۔ اس نے بٹیر کی چونچ ایسی بنائی کہ شہر بھر میں شہرہ ہو گیا۔ علی حسین ایک اور ان کا ہمجولی تھا۔ اس کو ورزش سے شوق تھا۔ بڑا ہو کے بے بدل بانکا ہوا۔ بڑے بڑے شورہ پشت اس سے ڈرتے تھے۔ سعادت گنج سے نخاس تک اور وہاں سے امین آباد تک اس کی دھاک تھی۔ حضرت عباس کا علم ایسا اٹھا یا کہ اتنا اونچا علم اس سے پہلے شہر میں نہ اٹھا اور پھر اس طرح کہ ڈولچی باندھی نہ ڈوریاں لگائیں۔ ان کے پھوپھی کے دو بیٹوں میں ایک سوز خواں تھا۔ ایک حدیث خواں۔

مرزا باقر حسین کے احباب میں سے ایک بزرگ مرزا حمید حسین نامی اس محلے میں رہتے تھے۔ ان کو شاعری کا خبط تھا۔ حسرت تخلص فرماتے تھے۔

صاحبزادے ان کے تصدق حسین صاحب ان کے ہم مکتب تھے۔ پڑھے لکھے تو واجبی تھے مگر بقول شخصے (الولد سیر الابیہ) تیرہ چودہ برس کے سن میں شعر موزوں کرتے تھے۔ وحشت تخلص تھا۔ طرح کی غزل کہہ کے مشاعرے میں پڑھی۔ ابتدائی غزل کا ایک شعر ایسا چست تھا کہ اس طرح کا یہ شعر ان کا یادگار رہ گیا۔ مشاعرے میں بار بار پڑھوایا گیا اور لوگ پڑھتے ہوئے گھر تک چلے گئے ؎

جنونِ قیس کا انداز جو تھا　　اسے زندہ کیا وحشت ہمیں نے

اس شعر میں اگرچہ کوئی بات نہ تھی۔ مگر ایک تو تخلص نے لطف بڑھا دیا دوسرے کم سن لڑکے کی زبان سے ایسا بھلا معلوم ہوا کہ لوگ بہت ہی محظوظ ہوئے۔

ہمارے مرزا عابد حسین صاحب کو شعر کے مذاق سے حس و مس نہ تھا مگر یہ بات نہ تھی کہ سمجھتے نہ ہوں۔ اس لیے کہ فارسی اپنے والد سے بہت تحقیق کے ساتھ پڑھی تھی۔ جب میاں وحشت نے دوسرے دن بڑے فخر سے یہ شعر مرزا عابد حسین کے سامنے پڑھا تو انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ ماحصل اس شعر کا یہ ہوا کہ قیس جیسا مجنوں تھا ویسا جنوں اس زمانے سے آج تک کسی کو نہیں ہوا ہم کو ویسا ہی جنون ہوا۔ میرے نزدیک تو اس شعر میں کوئی لطف نہیں ہے۔ نہ اس میں کسی حقیقت کا بیان ہے۔ نہ کوئی جذبۂ انسانی اس میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مجنوں کا تصور ہمارا یہ ہے کہ وہ ایک شاعر تھا اور اسی کی معاصر لیلیٰ نامی ایک شاعرہ۔ عرب کے لوگوں کو زمانۂ جہالت میں بیہودہ شاعری سے انتہا کا ذوق تھا۔ اکثر صحبتیں اس قسم کی ہوا کرتی تھیں۔ جسے ہمارے زمانے میں مشاعرہ کہتے ہیں۔ مجنوں اور لیلیٰ دونوں مشاعروں

میں شریک ہوا کرتے۔ گویا ان میں ایک قسم کا مقابلہ رہتا تھا۔ لیلیٰ ایسی خوبصورت نہ تھی مگر پھر بھی عورت تھی۔ عورتوں کی زبان میں قدرتی لوچ ہوتا ہے۔ مجنوں ازبسکہ اہلِ فن تھا۔ اس کو لیلیٰ کے اشعار بہت پسند آتے تھے۔ عشق کی اصل بنا یہ ہے۔ اگر قیس اسی حد تک رہتا تو اچھا رہتا۔ اب اس کو یہ ہوس ہوئی کہ لیلیٰ سے مواصلت ہو۔ اس لیے اس نے اپنے باپ کی زبانی شادی کا پیغام دیا۔ لیلیٰ کے باپ نے کسی وجہ سے انکار کر دیا۔ وجہ انکار کی جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ قیس اور لیلیٰ کی محبت مشہور ہو گئی تھی۔ اگر شادی ہو جاتی تو لوگ کہتے کہ پہلے سے ناجائز تعلق تھا۔ اسی ننگ کو لیلیٰ کے باپ نے گوارا نہ کیا۔ قیس کو از حد رنج ہوا۔ اپنے جذبات کو ضبط نہ کر سکا۔ اس لیے مجنون ہو گیا۔ اگر قیس کی سیرت میں قوت ہوتی تو وہ اس جذبے کو روکتا اور اسے روکنا چاہیے تھا۔ پھر ایسے ضعیف الیسرۃ شخص کی برابری کرنا کون سی فخر کی بات ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک عابد حسین صاحب کی یہ گرفت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ مرزا عابد حسین نے تاریخی قیس کو شعر کا موضوع قرار دے لیا ہے تاریخی اور شعری قیس (جس کو فلسفہ کی زبان میں قیس مثالی کہنا چاہیے) بڑا فرق ہے۔ مثالیہ قیس کو اہلِ فن نے عاشقِ کامل کی جگہ رکھا ہے اور عشقِ کامل ضروری نہیں ہے کہ عورت ہی کے ساتھ ہو بلکہ عشقِ عرفانی اصل مقصود اعلیٰ ہے۔ اور بیشک مایۂ فخر ہے۔ انسان کامل وہی ہے جو صاحبِ معرفت ہو۔ اب رہی یہ بات کہ مرزا صاحب کے کلام سے یہ بھی ایک پہلو اعتراض کا نکلتا ہے کہ اس میں خودستائی ہے جیسا کہ اکثر شعراء کا معمول ہے۔ یہ ایک امرِ لغو ہے۔ یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ اس وجہ سے کہ شاعر جہاں ادعا اپنی

ذات کا کرتا ہے۔ وہاں اس کا مقصود اپنی ذات نہیں ہوتی بلکہ اپنی ذات کا مثالیہ (جسے انگریزی میں آئیڈیل کہتے ہیں) مقصود ہوتا ہے۔ یعنی اگر میں ایسا ہوتا جس کو شاعر بقاعدۂ مجاز مرسل یہ فرض کر لیتا ہے کہ میں ایسا ہو گیا۔ تو یہ فخر زیبا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

لڑاتی ہے فلک سے مجھ کو میری ہمتِ عالی
تماشا دیکھ لیں زور آزمائی دیکھنے والے

اس شعر میں شاعر نے اپنی ہمت عالی پر فخر کیا ہے مگر یہاں بھی اس نے اپنی موجودہ حالت کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ ایک خلقی قصد کا اظہار کیا ہے۔ معنی اس شعر کے یہ ہوئے کہ مجھے ایسا ہونا چاہیے کہ اگر مجھ پر آسمانی بلائیں نازل ہوں تو میں بڑی مردانگی سے اس کا مقابلہ کروں۔

مگر بات یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ابتدائی عمر سے حقیقت میں ضرورتِ طبیعی سے کام رہا ہے۔ عالمِ خیال کی طرف متوجہ ہونے کا ان کو بہت ہی کم موقع ملا۔ پھر اس کے ساتھ ریاضیات کے شوق نے طبیعت کو ملاحظۂ حقیقت کا اور بھی عادی کر دیا، فلسفہ اور شعر ان دونوں سے ان کو کوئی بحث نہ تھی۔ وہ مجسم تجربہ تھے۔

جن لوگوں کو محض علوم تجارتی کا شوق ہوتا ہے۔ اگر ان کی طبیعت کو فلسفہ اور شعر سے مغائرت ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ مگر ایسے لوگ مذہب کی طرف سے بھی بے پرواہ ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے مرزا صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے مذہب میں بہت ہی پختہ تھے۔ ان کا بیان تھا کہ میں اصولِ مذہب میں کوئی امر علوم تجارتی کے خلاف نہیں پاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا مذہب بھی تجربی تھا۔ از بسکہ ان کی نشو و نما ایسے مذہب میں ہوئی

تھی جس کا اصول بالکل حسن اور عقل پر ہے لہٰذا ان کو اس بات میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ان کو اپنے مذہب کے اصول میں ایسی کسی بات کے ماننے کی ضرورت نہ تھی جو سمجھ میں نہ آتی ہو اور اسے تقلیداً مان لیتے ہوں۔ جیسا کہ بعض مذاہب کے اصول اولیہ محض تقلید پر ہیں۔ ان کا مذہب ایسا نہ تھا۔

اعتقادات کے باب میں ان کا یہ خیال تھا کہ جب مبادی مذہب درست ہوں تو اُمور تعبدی میں کوئی کلام نہ کرنا چاہیے۔

غزل گوئی، چائے نوشی، حقہ کشی، داستان یا سب سے عمدہ شغل مقدمہ بازی جو اکثر اہلِ شہر کا مذاق ہے۔ اس سے مرزا کو سروکار نہ تھا۔ ان کے مذاق کے دوست مثلاً سید جعفر حسین شہر میں موجود نہ تھے پھر شہر میں ان کا دل کیا لگتا۔ اپنے فارم (کشت زار) کو انھوں نے علمی اصول سے درست کیا تھا۔ اس فارم میں رہنے کا مکان تھا۔ زنانہ مکان سے ملا ہوا ایک اور مختصر سا مکان تھا۔ یہ ان کی لیبوریٹری (تجربہ گاہ یعنی وہ مکان جس میں حکماء علمی تجربہ کرتے ہیں) تھا۔ اسی میں حدادی اور بخاری کے آلات علم، کیمسٹری اور طبیعات کا سامان اور مختلف کلوں کے نمونے رہتے تھے۔ فارم کے نزدیک علم نباتات کے نمونے جمع کرنے کے لیے ایک قطعہ کئی بیگھہ کا علیحدہ کر دیا تھا۔ اسی کے قریب سمر ہوس تھا جس میں ہزارہا قسم کے فرن اور باج اور مختلف اقسام کے خوش نما درخت جمے تھے۔ اسی سمر ہوس میں ایک بیضوی حوض بنا ہوا تھا۔ اس کے درمیان میں اور سمر ہوس کے چاروں طرف پہاڑوں کے نمونے بنائے گئے تھے۔ لیبوریٹری کے پاس آبزرویٹری (رصد خانہ) بنا تھا اور اسی سے ملا ہوا ایک چھپر کے نیچے موسم کے ملاحظہ کرنے کے آلات نصب تھے۔ ماڈل ہوس یعنی وہ کمرہ جس

میں طرح طرح کے نمونے کلوں کے جمع کیے گئے تھے، اسی کے قریب تھا وہاں سے کسی قدر فاصلے پر اصطبل اور مویشی خانہ تھا۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر شاگرد پیشہ کے مکان تھے۔ یہاں فارم اگرچہ علم فلاحت کے تجربوں کے لیے مخصوص نہ تھا۔ مگر مرزا عابد حسین جس کشت زار کے کاشتکار ہوں، اس کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔

کھیتی کا کل کام مرزا عابد حسین خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ جوتائی، سراون، سینچائی، نکائی، غرض کہ کوئی کام سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل ایسا نہ تھا جس میں مرزا نوکروں اور مزدوروں سے زیادہ کام نہ کرتے ہوں۔ نوکر بھی مرزا نے ایسے رکھے تھے جو کاہل، حکم عدولی، بیہودہ حجت، بڑبڑانا جانتے ہی نہ تھے۔

زراعت کے کام کے لیے جو لوگ نوکر تھے بلکہ کل ملازموں کو خواہ مرد ہوں یا عورتیں، ایک طرح مرزا نے ان کو اپنا دائمی شریک بنا لیا تھا۔ پیداوار کی زیادتی اور کمی کے تناسب سے اناج حصہ رسدی تقسیم ہوتا تھا۔ اس لیے ہر شخص جی توڑ کے کام کرتا تھا۔ محنت اور برکت میں کچھ ایسا لزوم ہے کہ اگر ان کو مترادف لفظیں کہیں تو بے جا نہیں ہے۔ اوقاتِ فرصت میں مرزا اپنی لیبوریٹری میں رہتے تھے۔ ہر تجربہ اور مشاہدہ قلم بند کیا جاتا تھا۔ رصد خانے میں جو مشاہدات ہوتے تھے وہ علیحدہ کتاب میں تحریر ہوتے تھے۔ امور خانہ داری سے مرزا کو کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ مرزا اسے پسند کرتے تھے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ چکے ہیں۔ اس کو وہ بیوی کا فرضی کام سمجھتے تھے۔ گھر کا حساب کتاب سب وہ لکھتی تھیں۔ بیٹے بہو کا کارخانہ مرزا نے خود علیحدہ کر دیا تھا۔

تمام ملازمت کے زمانے میں مرزا پر بھی ایک سخت مصیبت پڑی تھی مرزا ہمیشہ نیک نام رہے۔ پہلے پہل سب اُوَرسیر ہوئے تھے۔ تیسرے درجے کے سب اُورسیر کی تنخواہ معمولی پچیس روپیہ اور سات روپیہ مہینہ بھتہ ہوتا ہے۔ بھتہ کے روپئے سے زیادہ گھوڑے پر صرف ہوتا ہے۔ بلکہ کچھ تنخواہ سے کھلانا پڑتا ہے۔ یہ تنخواہ بہ مشکل ایک متوسط درجے کے شریف آدمی اور اس کے اہل وعیال کے لیے کفایت کرسکتی ہے مگر مرزا ایسے محتاط آدمی تھے کہ انھوں نے اور ان کی بیوی نے ہمیشہ اصولِ کفایت شعاری کی سخت پابندی کی۔ اس وجہ سے کبھی کوئی دِقت خرچ کی طرف سے نہیں ہوئی۔

مرزا نے تیسرے درجے کی سب اُورسیری سے لے کر اسسٹنٹ انجنیر کے درجے تک کی ترقی کی۔ ان کا ذاتی خیال یہ تھا کہ واقعات پر نظر کرکے اس سے زیادہ ترقی ممکن نہ تھی۔ یہ ترقی مرزا کی لیاقت دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہ تھی۔ مرزا سے کم لیاقت لوگوں کی ترقی اس سے کہیں زیادہ ہوئی۔ افسوس ہے کہ ترقی کے باب میں بسا اوقات احتیاط اور لیاقت کارگذاری مفید نہیں ہوتی۔ اس کا کوئی معقول معیار موجود نہیں ہے۔ ترقی اور تنزلی، افسرِ اعلیٰ کی خوشی پر موقوف ہے۔ محکمہ جات سرکاری میں افسروں اور ماتحتوں کی تبدیلیاں بہت جلد ہوا کرتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے فوائد سے ہم اس وقت بحث نہیں کرتے۔ لیکن ایک ضررِ خاص اس سے متصور ہے۔ وہ یہ کہ افسر اور ماتحت میں کسی قسم کی ہمدردی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ ایک اوسط درجے کے قدرشناس افسر کو اس کا موقع بمشکل مل سکتا ہے کہ اپنے ماتحتوں کی دیانت، لیاقت اور کارگذاری کا اندازہ کرسکے۔ اس سے

اکثر حق تلفی ہوتی ہے۔ بہت سے مستحق محروم رہتے ہیں اور بہت سے غیر مستحق فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ایک تو اکثر حالات میں افسر اور ماتحت مختلف قوم اور ملک کے لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً افسر انگلش مین اور ماتحت ہندوستانی مسلمان۔ صاحب بہادر شہر کے باہر بنگلے میں فروکش ہیں۔ ماتحت وسط شہر کی کسی تاریک گلی میں رہتے ہیں۔ افسر اور ماتحت سے صرف دفتر میں سامنا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی سیرت اور اخلاق سے دونوں نابلد محض معمولی روزانہ کاروبار سے ماتحت کو اپنی لیاقت کے اظہار کا بہت ہی کم موقع مل سکتا ہے۔ مثلاً اسی محکمۂ تعمیرات میں ایک پُل یا کوٹھی کا تخمینہ ایک عام درجہ کا اسٹیمیٹر بھی تقریباً اتنے ہی وقت میں کر سکتا ہے جتنی دیر میں ایک اعلیٰ درجہ کا لائق انجینیر۔ یہ ایک معمولی کام ہے۔ اس قسم کے کام دفاتر میں لیے جاتے ہیں۔ اس سے افسر کو کیوں کر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا عابد حسین کی استعداد اور ذہانت اس سے زیادہ قابلِ قدر ہے جس کا اندازہ ان کے بُشرہ، قیافہ اور معمولی انداز کارگذاری سے کسی انگلش مین نے کیا ہے۔ ادائے حقوق کے لیے معقول پیمانہ معین ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ ایسا امرِ اہم محض بختِ اتفاق کے حوالے کر دیا جائے۔

یہ ایک قسم کی قرعہ اندازی ہے۔ ممکن ہے کہ قابلِ قدر صفات پر ان صاحبوں کی نگاہیں نہ پڑیں جن کی قدر شناسی پر کسی کے حقوق کا فیصلہ منحصر ہے۔ یہ سچ ہے کہ افسرانِ محکمہ جات ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی سی لیاقت کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن جس کی حق تلفی ہوئی اس کو ایسے ہی چیف جسٹس کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ ایک شخص کی عدمِ لیاقت سے دوسرے کا نقصان ہو۔ مگر ایسا ہوتا ہے۔ ہم اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے

کہ اس کا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر شاید اس میں کسی کو کلام نہ ہوگا کہ ہونا چاہیے۔ شعراء اکثر نامساعدت زمانہ کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ مضمون محض شاعرانہ نہیں ہے۔ دنیا نے نیکوں کو بہت نقصان پہنچایا اور اس سے دنیا کا بہت نقصان ہوا۔ یہ مشہور مقولہ ع ہر کسے را بہر کارے ساختند بہت ہی سچ ہے۔ یعنی ہر شخص ایک طبیعت اور مزاج خاص اور استعداد خاص لے کے پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اس کام میں نہ لگایا جائے جس کے لیے وہ پیدا ہوتا ہے تو اس سے ضیاعِ قوت متصور ہے۔ اس سے علاوہ شخصی نقصان کے نوعی نقصان بہت ہوتا ہے۔ اگر جارج اسٹفنسن تمام عمر کول میں کام کرنے پر مجبور ہوتا تو شاید ریلوے انجن ابھی پلیٹ فارم تک ہرگز نہ آسکتا۔

ہاں جسے جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ کر ہی لیتا ہے۔ یہ مقولہ ایک حد تک صحیح ہے۔ چیونٹی ہمالیہ پہاڑ کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔ ایک متنفس نظامِ معاشرت کی بہت بڑی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر نظامِ معاشرت ہر ہر فرد کے لیے علیحدہ انتظام نہیں کرتا تو ضرور ہے کہ کوئی قانون ایسا نکال دیا جائے جس سے ضیاعِ قوت نہ ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگر مرزا عابد حسین کی سیرت سے ان کے افسر بالا آگاہ ہوتے تو شاید اعلیٰ ترین عہدۂ محکمۂ تعمیرات تک ان کی ترقی ممکن تھی اور یہ نہ صرف ان کی ذات کے لیے بلکہ ملک و قوم کے لیے مفید ہوتا۔

افسروں اور ماتحتوں کی اجنبیت سے ملک کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے۔ ناقدر شناسی کی وجہ سے اکثر متدین اور کارگذار ماتحتوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جن میں شرافت و آزادی کا جوہر ہے وہ کوشش کے

بیل کی طرح ڈنڈے کے زور پر کام کرنا نہیں پسند کرتے مرزا عابد حسین صاحب کی طبیعت کے لوگ بھی ملک میں بہت ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ان کی قدر شناسی کرنا نظامِ تمدن پر واجب ہے۔

جھوٹا مقدمہ جو مرزا صاحب پر دائر کیا گیا جس میں ایک معتدبہ رقم اس روپے کی جسے انھوں نے کمالِ محنت اور جانفشانی اور کفایت شعاری سے برسوں کام کرکے پس انداز کیا تھا، بیرسٹروں کے نذر نہ ہو جاتی۔ اگر ان کے افسرِ اعلیٰ ان کے چال چلن سے کماحقہٗ واقف ہوتے

جو لوگ مرزا کو جانتے تھے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی مرزا کی نسبت سوءِ ظن نہ کرتے۔ اگر ان کا افسر بے پروائی نہ کرتا تو اس جعلی مقدمہ کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

مرزا کا قول تھا کہ مجھے اپنی زندگی میں افسروں کے استقرارِ ناقص اور اور سوءِ ظن سے بہت نقصان پہنچا۔ مذہب اور علم فری میسن کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو بے گناہ سمجھو۔ اسی سبب سے جو شخص کسی جرم کے ارتکاب کا الزام لگائے اس کو ثبوت کامل پہنچانا واجب ہے اور اس پر بھی شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے مگر میرے ساتھ زمانے نے اس کے برعکس سلوک کیا۔ اس لیے کہ اکثر ایسے ہی لوگوں سے کام پڑا جو ہر شخص کو گناہگار سمجھتے تھے اور بارِ ثبوت بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ مجھ ہی کو اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہوتی تھی۔ اور مشتبہ بھی بخلاف اصل اصول میرے ہی حق میں مضر تھا اگرچہ اس باب میں میرے ہی ملک کے نظامِ معاشرت کا قصور ہے۔ اس لیے کہ ملکی اخلاق کا معیار بہت گھٹا ہوا ہے۔ غیر ملکوں کے رہنے والے

اکثر ہندوستانیوں کو بے ایمان، کاہل اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے استثناء پر بہت ہی کم نظر جاتی ہے۔

مرزا کہتے تھے کہ دنیا ایمان دار لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے تھے کہ جس زمانے میں میں ضلع سہارنپور میں اوورسیر تھا۔ میری اردلی میں ایک چپراسی تھا۔ سید مسلمان اس کی سی احتیاط میں نے اس قسم کی تنخواہ والے ملازموں میں بہت کم دیکھی ہے۔ چپراسیوں کا قاعدہ ہے۔ جب دورے پر افسروں کے ساتھ جاتے ہیں۔ آٹا، دال، گھی، لکڑی، گڑ، تیل، مٹی کے برتن غرضکہ جملہ ضروریات جہاں تک ممکن ہوتا ہے غریب ناواقف دہقانوں سے طرح طرح کے فریب اور دھمکیاں دے کے بطور ناجائز حاصل کرتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے افسر یعنی چھوٹے درجے کے عہدہ دار بھی اس مظلمے میں ان کے شریک رہتے ہیں۔ خدا رحمت کرے محسن علی پر، لکڑیاں تک مول لے کے جلاتا تھا۔ اس کو سوائے پانچ روپیہ ماہواری تنخواہ کے اور کسی قسم کے فائدے اٹھانے سے غرض نہ تھی۔ مثل اور عقلائے حال کے مرزا کا بھی یہی خیال تھا کہ اس زمانے کا اخلاق بہ نسبت زمانۂ سابق کے بہت ہی تنزل پر ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ محکموں اور دفتروں میں شاذ و نادر خدا کے بندے ایسے ہیں جو حرام و حلال میں فرق کرتے ہیں۔ اکل حلال اور صدق مقال جو سب سے زیادہ عمدہ صفات انسانی ہیں ان کا ذکر کہیں نہیں۔

نوکری سے پنشن لے کے جب وطن میں آئے تو مرزا صاحب نے چند موضع مضافات لکھنؤ میں خرید کیے۔ اور ایک قطعہ نزدیک لکھنؤ میں لی۔ نزدیک زمین پر صوم و صلوٰۃ اور جمیع اعمال خیر باطل ہیں۔ اس لیے اب یہ فکر ہوئی کہ اصل مالک مکان سے اس بحل کرالیں۔ بڑی مشکل سے